فتنہ دیوبندیت

کی ابتدا

از علامہ عبدالحکیم اختر خاں
شاہجہانپوری رحمۃ اللہ علیہ

دُوسرے منصوبے کے دوران ، مولوی محبوب علی کی

دیوبندیت کی ابتدا: اِس تحریک سے علیحدگی بلکہ مخالفت کے بعد جب سیّد احمد صاحب کے پاس امدادی سامان و رقوم کی ترسیل کا سلسلہ اور نئی بھرتی کر کے افرادی امداد بھیجنے کا معاملہ تقریباً بند ہو کر رہ گیا ، تو مرکز سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کی گئی ، اُدھر مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۵ء) جانشینِ شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃُ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) بھی دولت کی اِدھر فراوانی دیکھ کر کسی قدر مائل ہو چکے تھے ، لہٰذا جلد ہی اِن کے ساتھ رابطہ قائم ہو گیا یا قائم کر دیا گیا ۔ مولوی محمد اسحاق دہلوی بڑی حد تک صلح کُل اور خاموش طبع عالِم تھے ۔ اِس خارجی ٹولے کے ساتھ بھی

کسی قدر ہاں میں ہاں ملانی شروع کردی لیکن ایسے انداز میں کہ وہابیوں کی جو رُسوائی ہو رہی تھی اُس سے بچنا اور علمائے اہلسنّت کی نگاہوں میں اپنا وقار بھی بحال رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تقویۃ الایمان میں جن امور کو کفر و شرک ٹھہرایا گیا ہے۔ آپ نے اپنی تصنیف "مائۃ مسائل" میں، اُن میں سے بعض باتوں کو حرام اور بعض کو ناجائز یا مکروہ لکھا ہے۔ موصوف کی یہ دوغلی پالیسی بھی اُن کے وقار کو قائم رکھنے میں کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ علمائے اہلسنّت کی نگاہوں میں وہ گرنے شروع ہو گئے تو شرمندگی سے بچنے کی خاطر ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے۔ موصوف کی اِس دوغلی روش کے بارے میں جناب ابوالکلام آزاد نے یوں وضاحت پیش کی ہے:

"اُنھوں (مولانا ابوالکلام کے والد مولانا خیر الدین) نے وہابیت کو دو اصولی قسموں میں بانٹ دیا تھا۔ کہتے تھے، دو فرقے ہیں، ایک اسمٰعیلیہ ہے دُوسرا اسحاقیہ۔ اسمٰعیلیہ سے مقصود وُہ فرقہ تھا جو رسوم و بدعات کی مخالفت کے ساتھ تقلید شخصی کا بھی تارک (یعنی غیر مقلد وہابی) ہو، جیساکہ مولانا اسمٰعیل شہید نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین وغیرہ میں لکھا ہے۔

اسحاقیہ سے مقصود وُہ فرقہ ہے، جو حنفیت و تقلید سے تو انکار نہیں کرتا لیکن بدعات و رسوم کا مخالف (مقلد وہابی) ہے۔ اِس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ شاہ اسحاق نے مائۃ مسائل میں بدعات و رسوم سے اختلاف کیا ہے مگر تقلید و حنفیت کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے۔ وہ (مولانا خیر الدین جالندھری) کہتے تھے کہ جب اسمٰعیلیہ غیر مقبول ہو گئی تو وہابیت نے اپنے مکائد کی اشاعت کے لیے راہِ تقیہ اختیار کر لی اور حنفیت کی آڑ قائم کر کے اپنے دیگر عقائد کی اشاعت کرنے لگے۔"[۱]

مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) اصل میں اُس وہابی گروہ کے

---

[۱] ابوالکلام آزاد، مولوی: آزاد کی کہانی، ص ۱۶۵

۳ ۲ ۱

بانی ہیں جو مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت یعنی محمدی یا موحّد یا اہلحدیث جماعت کے ناکام رہ جانے کے بعد پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہابیت کے سلسل سے بچنے اور سُنّیوں میں بھرم رکھنے کی خاطر موصوف ہجرت کر گئے اور جاتے وقت اپنے نئے گروہ کے مفادات کا تحفظ کرنے کی خاطر مولوی مملوک علی نانوتوی کی قیادت میں ایک بورڈ کی تشکیل کر گئے۔

پروفیسر محمد ایوب قادری نے اِس امر کا تذکرہ یُوں کیا ہے:

"مولانا عبیداللہ سندھی کا خیال ہے کہ جب ۱۲۵۷ھ میں شاہ اسحاق حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے تو تحریک (ماڈرن وہابیت) کی نگرانی کے لیے ایک بورڈ بنایا گیا، جس کے صدر مولانا مملوک العلی اور تین رکن، مولانا نواب قطب الدین (ف ۱۲۸۹ھ)، مولانا مظفر حسین کاندھلوی (ف ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ، م ۲۵ مئی ۱۸۶۶ء) اور مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی (ف ۶ محرم ۱۲۹۵ھ) تھے۔" [۱]

مولانا عبیداللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) کے اِس سلسلے میں جو تاثرات تھے، بہتر یہی نظر آتا ہے کہ اُنھیں خود مولانا سندھی کے لفظوں میں ہی بیان کر دیا جائے۔ چنانچہ موصوف یُوں وضاحت کرتے ہیں:

"مولانا محمد اسحاق مکّہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی اور مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنا دیا، جو اِس نئے پروگرام (یعنی وہابیت کی جدید تشکیل) کی اشاعت کر کے نئے سِرے سے جماعتی نظام پیدا کرے اور یہی جماعت ہے جو آگے چل کر دیوبندی نظام چلاتی ہے۔" [۲]

---

[۱] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۷۸

[۲] عبیداللہ سندھی، مولوی: شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک، ص ۱۱۰

مولوی مملوک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء)

اینگلو انڈین علماء کی کھیپ: جو وہابیوں کی نئی جماعت کے سرپرست مقرر کیے گئے تھے۔ وُہ دہلی کالج میں شعبۂ عربی کے صدر مدرس تھے۔ تجویز یہی ہُوئی ہوگی کہ جماعت میں عام لوگوں کی باقاعدہ بھرتی کرنے سے پہلے ایسے علماء تیار کیے جائیں، جو گورنمنٹ کے پروردہ اور وہابیتِ جدیدہ کے دلدادہ ہوں۔ چنانچہ خاموشی اور مستعدی سے اینگلو انڈین علماء کی کھیپ دہلی کالج میں تیار کی جانے لگی۔ مولوی مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

"نانوتہ کے لیے تعلیمی راہ کا دروازہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے کھُل چکا تھا۔ وہ دہلی میں مقیم تھے اور دہلی کی سب سے بڑی مرکزی درسگاہ، دہلی کالج کے اُستاد تھے۔ نہ صرف نانوتہ بلکہ عثمانی شیوخ کی برادری اطراف وجوانب کے جن قصبات میں پھیلی ہُوئی تھی وہاں تک کے بچے مولانا مملوک العلی کے اِن خاص حالات سے کافی استفادہ کر رہے تھے۔" [1]

دہلی کالج سے جس قسم کے علماء کی کھیپ تیار کی جا رہی تھی، وہ گورنمنٹ کے منظورِ نظر بن کر نکلتے تھے اور وہی انگریز جو مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھانے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے، وُہ اِس کالج کے تیار کردہ علماء کو دوڑ کر سینے سے لگاتے اور جلد از جلد اُنھیں برسرِ روزگار کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ قادری صاحب رقمطراز ہیں:

"مولانا مملوک العلی دہلی کالج کے شعبۂ عربی کے صدر مدرس تھے اس لیے نانوتہ اور دیوبند کے حضرات اِن کی وجہ سے کالج کے تعلیمی وظائف اور دُوسری سہولتوں سے بھی مستفید ہُوئے ہوں گے اَور دہلی کالج کے فارغ التحصیل ہونے کی وجہ سے سرکاری اداروں میں منسلک ہونے میں بھی آسانی رہی ہوگی۔ بلکہ اِن حضرات کے سرکاری اداروں میں تقرر کے لیے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کو بھی ایک قسم کی سند خیال کیا گیا اور یہ سمجھا

---

[1] مناظر احسن گیلانی، مولوی: سوانح قاسمی، ج ۱، ص ۲۱۰

گیا ہو گا کہ یہ حضرات دہلی کالج کے ذریعے طریقۂ تعلیم وغیرہ سے واقف ہو چکے ہیں، ورنہ اتنی آسانی سے قدیم طرز کے فارغ التحصیل علماء کو گورنمنٹ، سرکاری اسکولوں، کالجوں اور محکمۂ تعلیم کے ذمہ دار عہدوں پر مقرر نہیں کر سکتی تھی۔" [1]

زمانے کی نیرنگیاں عجیب ہیں، ایک وقت تھا کہ مولوی مملوک علی نانوتوی اہلسنت و جماعت میں شامل تھے اور ہندی وہابیت کے سنگِ بنیاد یعنی تقویۃ الایمان کو تفویۃ الایمان (ایمان کو ختم کرنے والی کتاب) کہا کرتے تھے لیکن ایک وہ وقت آیا کہ وہابیہ کے جدید بیڑے کا امیر البحر بننا بھی منظور کر لیا۔ مولوی مملوک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) نے مطلوبہ علماء کی جو کھیپ تیار کی اُن میں سے چند حضرات کے نام یہ ہیں:

"مولانا مملوک العلی کے تلامذہ کی تعداد کا استحصاء ناممکن ہے۔ اُن کے شاگردوں میں بڑے بڑے علماء مثلِ مولانا مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی، مولوی کریم الدین پانی پتی، منشی جمال الدین مدار المہام بھوپال، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین ایل۔ایل۔ڈی، مولوی عالم علی مراد آبادی (ف ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء)، مولوی سمیع اللہ دہلوی، مولانا عبدالرحمٰن پانی پتی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔" [2]

مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت، جو آجکل اہلحدیث کے نام سے متعارف ہے جب متحدہ ہندوستان میں غیر مقبول ہو کر راندی گئی تو مولوی مملوک علی کی سرپرستی میں دوسری جماعت بنانے کی سکیم تیار کی گئی پہلے اُس کے چلانے والے علماء تیار کیے گئے،

---

[1] محمد ایوب قادری: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۲۷

[2] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۰۳

اِس کے بعد برٹش گورنمنٹ نے اپنے اُن منظورِ نظر علماء کو کس طرح اور کہاں کہاں مسلمانوں پر مسلّط کیا، ایک دہلی کالج کی کتنی برانچیں اور ذیلی شاخیں قائم کی گئیں، اِس سلسلے میں مشہور دیوبندی عالم، مولوی عبیداللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) یُوں رقمطراز ہیں:

"۱۸۵۷ء میں اِس جماعت کی مرکزی قوت میں سلطانِ دہلی کی طرفداری اور غیر جانبداری کی بنا پر ایک اختلاف رُونما ہُوا اور یہ جماعت دوؔ حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ بعد میں اِس جماعت کے دہلی کے ایک مرکز کی بجائے دیوبند اور علی گڑھ دوؔ مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم، دہلی کالج کے عربی عرصہ کو دیوبند لے گئے اور سر سیّد احمد خاں نے کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچا دیا۔"[1]

نئے مراکز یعنی دیوبند اور علی گڑھ کا برٹش گورنمنٹ کے بارے میں کیا نظریہ تھا، مولوی عبدالخالق قدوسی کی زبانی سُنیئے:

"دل کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے بظاہر علی گڑھ فریق اور دیوبندی جماعت گورنمنٹ کے معاملہ میں قدم سے قدم ملاتے نظر آتے ہیں۔ دونوں کا مقصد علمی میدان میں مسلمان قوم کو آگے بڑھانا ہے۔ حصولِ مقصد کے لیے انگریز سے کامل وفاداری کو دونوں ہی ذریعہ سمجھتے ہیں۔"[2]

دیوبند مرکز

بظاہر معلوم یہی ہوتا ہے کہ مسلمانانِ پاک و ہند میں سے سرکاری تعلیم حاصل کرنے والوں کو علی گڑھ میں تربیت دینے اور دینی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کو مدرسہ دیوبند میں مخصوص انداز پر ڈھالنے کی مہم چلائی گئی۔ بعض وہ مسلمان تھے جو دہلی کالج کی انگریزی تعلیمات سے کتراتے تھے تو دُوسرے دینی علوم سے جان چراتے تھے، دونوں قسم کے حضرات کو پابندِ سلاسل رکھنے کی خاطر ایک مرکز کے علیحدہ علیحدہ دو مرکز بنا دیے گئے۔ جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے وہ قطعی طور پر واضح ہے کہ حکومت کی

[1] عبیداللہ سندھی، مولوی: شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک، ص ۱۱۲

[2] ہفت روزہ الاعتصام، لاہور۔ بابت ۹ر اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

فرماں برداری کرنے اور اِس طرح حکومت کا اعتماد حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ مراعات و عنایات کی بھیک مانگ کر پھلنے پھولنے کے مواقع حاصل کرنا تھا اور قوم کے انگریزی خوان یا مولویانہ ذہن رکھنے والوں کو اِسی غلامانہ ذہنیت کی افیون کھلا کر اپنے اپنے دائرۂ کار میں کُھل کھیلنے کے مواقع فراہم کرنے تھے۔ دونوں مراکز کے راستے الگ الگ لیکن منزلِ مقصود ایک تھی۔

انسانی فطرت کی یہ کمزوری کون سی ڈھکی چھپی بات ہے کہ وُہ کوئی غلط اقدام کرے یا ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے تو بسا اوقات وہ تاویلات کا سہارا لیتا ہے اور اُس غلط حرکت کو درست منوانے کی اِس انداز سے سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ گویا دُوسروں کا اُس کی صحت پر ایمان لانا ہی اوّلین فریضہ اور اُن کا مقصدِ حیات ہو۔ اِس مرحلے پر خواہ زاویۂ نظر کتنا ہی خلافِ دین و دیانت ہو جائے اُس کی کم ہی پروا کی جاتی ہے۔ ایسے واقعات کا مظاہرہ اگر ایک فرد سے سرزد ہو اُس کی سنگینی کا عالم اَور ہے لیکن یہی طرزِ عمل اگر جماعتی طور پر اختیار کر لیا جائے تو اُس کی مضرت کا ایسے حالات میں اندازہ لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ دہلی کالج کو علی گڑھ اور دیوبند کے مراکز میں تبدیل کرنے کی وجہ بالکل صاف اور سیدھی سادی بات تھی لیکن حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ افسانہ نویسی میں بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ مدرسہ دیوبند کے موجودہ مہتمم قاری محمد طیب صاحب فرماتے ہیں:

> "اچانک چند نفوسِ قدسیہ نے بالہامِ خداوندی اپنے دل میں ایک خلش اور کسک محسوس کی۔ یہ خلش علومِ نبوت کے تحفّظ، دین کو بچانے اور اِس کے راستے سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ (چشم بددُور) ایک جگہ جمع ہُوئے اور اس بارہ میں اپنی اپنی قلبی واردات کا تذکرہ کیا جو اُس پر مجتمع تھیں۔"[1]

موصوف اِسی سلسلے میں مزید یُوں وضاحت فرماتے اور قارئین کو خواب آور گولیاں کھلاتے ہیں:

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولانا: بیس بڑے مسلمان، ص ۲۴

"اِس سے جہاں یہ واضح ہے کہ اُس وقت کے ہندوستان میں یہ تجویز کوئی
رسمی تجویز نہ تھی بلکہ الہامی تھی، وہیں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس تجویز کے پردہ
میں ملک گیر اصلاح کی سپرٹ چھپی ہُوئی تھی۔" [1]

اگر انبیائے کرام کے علوم و معارف کا ذکر آ جائے تو علمائے دیوبند کی برداشت کا پیمانہ نہ صرف لبریز ہو جاتا ہے بلکہ اکثر اوقات اِس طرح چھلک اٹھتا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر کفر و شرک کا فتویٰ جڑ دینا گویا تکیۂ کلام بن جاتا ہے۔ لیکن یہی حضرات جب اپنے مولویوں کا ذکر کرتے ہیں تو سُننے اور پڑھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو دروازے اِن کے بقول انبیائے کرام پر بھی بند تھے وہ علمائے دیوبند کے لیے کس طرح اور کس نے کھول دیے؟ اور پھر وُہ یہ خلش محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ جن باتوں کے حصول کا یہ حضرات انبیائے کرام تک کے لیے انکار کرتے ہیں، وُہی باتیں اپنے علماء کے لیے کیوں ثابت کرتے رہتے ہیں؟ آخر یہ اپنے علماء کا مقام انبیائے کرام سے بھی اُونچا دکھانے میں کیوں کوشاں رہتے ہیں؟ آئیے، قاری محمد طیب صاحب کا ایک بیان اور ملاحظہ فرمائیے:

"حضرت سیّد احمد شہید رائے بریلوی دیوبند سے گزرتے ہُوئے جب اُس
مقام پر پہنچے تھے، جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہُوئی ہے تو فرمایا تھا
کہ مجھے اِس جگہ سے علم کی بُو آتی ہے۔" [2]

جب مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی گئی تو جھونپڑیوں میں کام شروع کیا گیا تھا۔ ذرائع ابلاغ کی ہمہ گیری نے آج تو اعلان اور پروپیگنڈے کے انداز ہی بدل دیے۔ لیکن جب یہ ذرائع حاصل نہ تھے اُس وقت بھی آخر تبلیغ اور پروپیگنڈے کے پسندیدہ طریقے موجود تھے مگر کارکنانِ دارالعلوم دیوبند نے اُس وقت بھی اپنے پروپیگنڈے کی بنیاد کشف و کرامات پر رکھی جو وہابیت و دیوبندیت کی ضد ہے۔ چنانچہ مفتی عزیز الرحمٰن نہٹوری لکھتے ہیں کہ:

---

[1] عبدالرشید، مولانا: بیس بڑے مسلمان، ص ٢٥

[2] ایضاً: ص ٢٩

"جس وقت دیوبند کے مدرسہ میں چھپر پڑے ہوئے تھے، آپ (مولانا محمد یعقوب صاحب) نے خواب میں دیکھا کہ جنت میں مکان کچے ہیں اور اُن پر چھپر پڑے ہیں۔ جب بیدار ہوئے تو فرمایا کہ الحمدُ للہ، مدرسہ کے یہ مکانات مقبول ہیں۔" [1]

مدرسہ دیوبند کے قائم کرنے کی ضرورت کس کو پیش آئی تھی؟ اِس کے بانی، مدرس اور چلانے والے کون حضرات تھے؟ اِس سلسلے میں جماعت اہلحدیث کے مشہور عالم، مولوی عبدالخالق قدوسی یُوں لکھتے ہیں:

"ایسے میں چند ایسے حضرات میدان میں آئے جن کی پُوری تربیت گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں میں ہُوئی تھی اور سرکاری ملازمت میں رہ کر وُہ اپنے آپ کو گورنمنٹ کے مکمل وفادار ثابت کر چکے تھے۔ اُنھوں نے دیوبند میں ایک عربی دینی مدرسہ "دار العلوم" کی بنیاد رکھ دی۔ اُوپر کے بیان کردہ پس منظر میں دیکھا جائے تو دینی تعلیم کا یہ اہتمام، گورنمنٹ انگریزی کی منشا اور پالیسی کے مطابق تھا اور چونکہ اِس پہلے دینی مدرسہ کے یہ بانی اور صدر مدرس، دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور سرکاری ملازمت میں رہ کر گورنمنٹ کا مکمل اعتماد حاصل کر چکے تھے، نیز یہ حضرات ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے سے ریٹائر ہُوئے تھے، اِس لیے قدرتاً انگریزی گورنمنٹ نے اُن کی حوصلہ افزائی فرمائی، بلکہ انگریزی ڈپلومیسی کی روشنی میں دیکھا جائے تو کوئی بعید نہیں کہ اِس مدرسہ کے قیام میں اُس (حکومت) کا کسی طرح کا ایماء شامل ہو۔" [2]

قاری محمد طیب صاحب نے دارالعلوم دیوبند کے بانی، موسس، اراکینِ مجلس اور معادنین کا تذکرہ یُوں کیا ہے:

"اِس بنا میں خصوصیت سے حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب قدس سرہٗ،

---

[1] عزیز الرحمٰن نہٹوروی، مفتی: تذکرہ مشائخ دیوبند، ص ۱۷۷

[2] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب قدس سرہٗ اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ قابلِ ذکر ہیں، جن کا ہاتھ ابتداء ہی سے تاسیسِ مدرسہ میں تھا۔ یہ حضرات خصوصیت سے حضرت نانوتوی صاحب قدس سرہٗ (مولانا محمد قاسم) کے دست و بازو رہے ہیں اور بنا کے بعد بھی اِس کی ذمہ دار مجلس کے رکنِ رکین کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام امور میں عملاً شریک رہے ہیں۔'' [۱]

دارالعلوم دیوبند کا سب سے پہلا صدر المدرسین کون مقرر کیا گیا؟ پروفیسر محمد ایوب قادری یُوں جواب دیتے ہیں:

''جب ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ کو مدرسہ اسلامیہ دیوبند قائم ہوا، تو مولانا محمد یعقوب صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اُس وقت مولانا محمد یعقوب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔'' [۲]

مولوی عبدالخالق قدوسی نے موصوف کی تقرری کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یُوں کیا ہے:

''قیامِ مدرسہ کے بعد سب سے پہلے صدر مدرس کی حیثیت سے جس شخص کا تقرر ہُوا وہ مولانا مملوک العلیؒ کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوبؒ نانوتوی تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ بزرگ بھی بانیانِ مدرسہ کی طرح ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ سے ریٹائر ہُوئے تھے۔ یہ بزرگ بھی ۱۸۵۷ء کے وقت اِسی عہدہ پر فائز تھے۔'' [۳]

بانیانِ مدرسہ اور اُس کی مجلس کے خاص اراکین میں سے مولوی ذوالفقار علی دیوبندی اور مولوی فضل الرحمٰن دیوبندی نیز اِس مدرسہ کے اوّلین صدر مدرس یعنی مولوی محمد یعقوب نانوتوی کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھتے ہُوئے اِن حضرات کی ملازمتوں کا اظہار

---

[۱] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۲۶

[۲] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۹۲

[۳] ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور، بابت ۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

کر کے ایک بہت بڑی الجھن کو سُلجھا دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :

"دہلی کالج کے فاضل مدرس، مولانا مملوک العلی کے وطن و برادری کے جن حضرات نے مولانا کی سرپرستی میں تعلیم پائی وہ حضرات بھی تعلیمی نظام میں منسلک نظر آتے ہیں ۔ مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی اور مولانا ذوالفقار علی دیوبندی ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے ۔ مولانا مملوک العلی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی اجمیر کالج میں مدرس مقرر ہوئے پھر بنارس، بریلی اور سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے ۔" [1]

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کے بارے میں ایک جگہ موصوف نے یُوں مزید وضاحت فرمائی ہے :

"شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی بریلی کالج میں پروفیسر تھے ۔ مولانا ذوالفقار علی کا بریلی میں کئی سال قیام رہا ۔" [2]

مدرسہ دیوبند کے اوّلین صدر مدرس مولوی محمد یعقوب نانوتوی اور مولوی فضل الرحمٰن دیوبندی کے بارے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے :

"مولانا محمد یعقوب بھی بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے ۔ مولانا محمد احسن کی بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی بریلی میں تھے ۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی بھی ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء میں بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے ۔ جب مولانا محمد احسن نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں بریلی کو چھوڑا تو بعض معاملات و انتظامات ضروری مولانا فضل الرحمٰن ہی کے سپرد کیے تھے ۔" [3]

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر : مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۳۸

[2] ایضاً : ص ۴۵

[3] ایضاً : ص ۴۶

اگر پروفیسر فیروز الدین رُوحی ناراض نہ ہوں اور ہمیں اِس جسارت پر معذور سمجھتے ہُوئے م
فرمادیں تو ہم اُن کی خدمت میں یہ التجا بصد ادب کرتے ہیں کہ وُہ اپنے ممدوحین علمائے دیو
یعنی برٹش گورنمنٹ کے پروردہ اور ریڈی میڈ نہیں، بلکہ تیار کردہ اینگلو انڈین علما
بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب کا یہ بیان پڑھیں اور اِسے اپنی تصنیف
جس کا غلطی سے "آئینۂ صداقت" نام لکھ بیٹھے ہیں، درج فرمالیں، کیونکہ درجِ ذیل د
بیان اگر "آئینۂ صداقت" کے اگلے ایڈیشن میں ایڈ کر لیے جائیں تو اِن کے پڑھ لینے
بہتوں کا بھلا ہوگا - لیجیے پہلا بیان موصوف کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

"مولانا مملوک العلی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے بھی دہلی کالج کی تعلیمی سرگرمیاں یقینی آگے بڑھیں اور مسلمانوں (اینگلو انڈین علماء) کی ایک ایسی کھیپ تیار ہُوئی کہ جس نے نئے نظامِ تعلیم میں منسلک ہو کر خاطر خواہ خدمات انجام دیں - مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج)، مولانا محمد منیر (مدرس بریلی کالج)، مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج)، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، مولانا فضل الرحمن دیوبندی (ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، تو خاص اِن کے اعزہ واحباب ہیں - اِن کے علاوہ شمس العلماء شیخ ضیاءُ الدین ایل-ایل-ڈی، شمس العلماء مولوی ذکاءُ اللہ، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء)، شمس العلماء محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء)، پیرزادہ محمد حسین (سشن جج)، خواجہ محمد شفیع (جج)، خان بہادر میر ناصر علی (ف ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء)، مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹ء)، مولوی جعفر علی (ف ۱۳۱۴ھ) وغیرہ بہت سے ایسے حضرات ہیں کہ جو اِسی دہلی کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور کم و بیش اِن تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسلک ہو کر نمایاں خدمات انجام دیں اور گورنمنٹ نے بھی اِن کی خدمات کو سراہا اور حُسنِ صلہ سے نوازا۔"[1]

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۷۷

جس مقصد کی خاطر برٹش گورنمنٹ نے مدرسہ دیوبند قائم کرنے کا اِن حضرات کو الہام کیا تھا، حکومت کا وُہ مقصد کہاں تک پُورا ہو رہا تھا؟ حکومت نے اِس امر کا خفیہ طور پر جائزہ لیا۔ پڑتال کرنے والے انگریز افسر کے تاثرات یہ تھے:

"اِس مدرسہ نے یوماً فیوماً ترقی کی۔ ۳۱ جنوری ۱۸۷۵ء بروز یکشنبہ لیفٹیننٹ گورنر کے ایک خفیہ معتمد انگریز مسمّٰی پامر نے اِس مدرسہ کو دیکھا تو اُس نے نہایت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ اُس کے معائنہ کی چند سطور درجِ ذیل ہیں" جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے صرف سے ہوتا ہے وُہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں روپیہ تنخواہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیہ ماہانہ پر کر رہا ہے۔ یہ مدرسہ خلافِ سرکار نہیں بلکہ ممد و معاونِ سرکار ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ ایسے آزاد اور نیک چلن (سلیم الطبع) ہیں کہ ایک کو دوسرے سے کچھ واسطہ نہیں۔ کوئی فن ضروری ایسا نہیں جو یہاں تعلیم نہ ہوتا ہو۔ صاحب مسلمانوں کے لیے تو اِس سے بہتر کوئی تعلیم اور تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی اور میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہُوں کہ غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پاوے تو خالی نفع سے نہیں۔ اے صاحب! سُنا کرتے تھے کہ ولایتِ انگلستان میں اندھوں کا مدرسہ ہے، یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریرِ اقلیدس کی شکلیں کفِ دست پر ایسی ثابت کرتے ہیں کہ باید و شاید۔" [۱]

مولوی عبدالخالق قدوسی نے اِس معائنہ پر جو تبصرہ کیا ہے، سرِدست وُہ بھی ملاحظہ فرمایا جائے۔ چنانچہ موصوف نے مذکورہ واقعہ نقل کرنے کے بعد یُوں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے:

"معائنہ کرنے والے انگریز نے اپنی رپورٹ کے اِس ٹکڑے میں دارالعلوم

---

[۱] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۲۱۷

دیو بند کی دو خصوصیات بتائی ہیں۔ (۱) موافقِ سرکار (۲) ممد و معاونِ سرکار۔
پہلی خصوصیت تو واضح ہے کہ اس مدرسہ میں کام کرنے والے لوگ
سرکارِ انگریزی کے پورے پورے وفادار ہیں اور یہاں کسی قسم کی بغاوت
کے جراثیم موجود نہیں، لیکن دوسری خصوصیت کہ یہ مدرسہ سرکار کا معاون
بھی ہے، غور طلب ہے، سوال یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا مدرسہ جس میں
چند درویش منش بزرگ صبح و شام عموماً قال قال ابوحنیفہ کی تعلیم دیتے ہوں،
برطانیہ جیسی عظیم سلطنت سے کیا تعاون کر سکتے تھے؟" [1]

مولوی عبدالخالق قدوسی کو مسٹر پامر کی اس رپورٹ پر کہ یہ مدرسہ ممد و معاون سرکار ہے
حیرانگی تھی کہ چند ملاؤں کا جمگھٹا، برطانیہ جیسی عظیم سلطنت کی کیا مدد کر سکتا تھا؟ لیکن موصوف
اس رابطے کے منکر نہیں ہیں بلکہ اس امداد و اعانت کے بارے میں وہ خود یوں رقمطراز ہیں

"یہ تو ہم نہیں کہتے کہ یہ لوگ ۱۸۵۷ء کے بعد میدانِ جنگ میں انگریزی فوج کے
شانہ بشانہ مجاہدین کے خلاف لڑے تھے اور نہ ہی ہمارے پاس کسی قسم کے
مادی تعاون کا کوئی ثبوت ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ ۱۸۶۵ء میں
بننے والے اس دینی مدرسہ نے جذبۂ جہاد کو سرد کرنے کے لیے بڑا اہم کردار
ادا کیا اور ہماری رائے میں یہی وہ خدمتِ جلیلہ ہے جسے مسٹر پامر اپنے الفاظ
میں کہہ رہے ہیں، کہ یہ مدرسہ ممد و معاونِ سرکار ہے۔" [2]

مدرسہ دیو بند کے چھ ماہ بعد اسی دہلی کالج کے پروردہ اور مولوی مملوک علی نانوتوی (المتوفی
۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء) کے شاگردوں نے "مظاہر العلوم" کے نام سے سہارنپور میں دوسرا
مدرسہ بھی قائم کر لیا۔ قدوسی صاحب لکھتے ہیں:

"اسی پُرسکون ماحول میں علمائے احناف (وہابی دیو بندی علماء) نے ۱۸۶۷ء

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۵

[2] ایضاً، ص ۶

کو دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور اس سے صرف چھ ماہ بعد مظاہر العلوم (سہارن پور) کا قیام عمل میں آیا۔ ان مدارس نے حیرت انگیز حد تک ترقی کی۔ اوّل الذکر مدرسہ کو بجا طور پر ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں مدرسے ۱۸۶۷ء میں قائم ہوئے لیکن ان کا تصور ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد بعض ذہنوں میں آچکا تھا، بلکہ مولانا عبیداللہ سندھی تو دارالعلوم دیوبند کو دہلی کالج کا ہی ایک حصہ قرار دیتے تھے"۔[1]

اینگلو انڈین علماء کی دوسری دینی درسگاہ یعنی مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کس نے قائم کیا؟ صدر مدرس اور پہلے شیخ الحدیث کون مقرر ہوئے؟ اس بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں وضاحت فرماتے ہیں:

"رجب ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء میں مولوی سعادت علی سہارن پوری نے ایک مدرسہ سہارن پور میں جاری کیا۔ مولوی سخاوت علی انبیٹھوی، مولوی عنایت علی اور حافظ قمر الدین مدرس مقرر ہوئے۔ تین مہینے کے بعد شوال ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء میں مولانا محمد مظہر نانوتوی اس مدرسہ کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مقرر ہوئے۔ جب مدرسہ کو ترقی ہوئی تو حافظ فضل حق نے اپنے مکان کو مدرسہ کے لیے وقف کر دیا۔ مکان کی عمارت توڑ کر مدرسہ کی عمارت تعمیر کی گئی۔ حافظ فضل حق (ف ۱۳۰۲ھ) مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے مرید اور مولانا محمد مظہر صاحب کے مخلص دوست تھے۔ مدرسہ تعمیر ہونے کے بعد مدرسہ کا نام "مظاہر العلوم" تجویز ہوا۔ مولانا احمد علی محدث سہارن پوری بھی اس مدرسہ کے معین و مددگار رہے تھے۔ مدرسہ مظاہر العلوم ہندوستان کی مشہور اسلامی درسگاہ ہے۔ اس نے مذہب و علوم اسلامی کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ بڑے بڑے

---

[1] ہفت روزہ "الاعتصام"، لاہور، بابت ۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

نامور علماء اِس درسگاہ سے فارغ التحصیل ہوکر نکلے اور برّ صغیر پاک وہند میں دین وملّت کی خدمات میں مصروف ہیں۔" [1]

مدرسہ مظاہر العلوم کے صدر مدرس مولانا محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء) کون تھے اور کہاں کے فیض یافتہ تھے؟ اِس سوال کا جواب پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقم فرماتے ہیں:

"مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔ ۱۸۲۳ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وحفظِ قرآن اپنے والد حافظ لطف علی سے کیا۔ "دہلی کالج" میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا مملوک العلی نانوتوی کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ حدیث کی سند حضرت شاہ محمد اسحاق سے حاصل کی۔۔۔۔ مولانا محمد مظہر تحصیلِ علم کے بعد اجمیر کالج میں ملازم ہو گئے، وہاں سے آگرہ کالج تبادلہ ہوا۔" [2]

مولوی محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء) کے دُوسرے بھائی مولوی محمد احسن نانوتوی (المتوفی ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴ء) بھی مولوی مملوک العلی کے شاگرد اور دہلی کالج کے پروردہ تھے۔ تحصیلِ علم کے بعد موصوف بنارس کالج اور بریلی کالج میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ چنانچہ اِس سلسلے میں قادری صاحب نے یُوں وضاحت فرمائی ہے:

"اِسی طرح مولوی مملوک العلی کے عزیز و تلمیذ مولانا محمد احسن جب تعلیم سے فارغ ہُوئے تو ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں بنارس کالج میں بحیثیت مدرس اوّل فارسی اِن کا تقرر ہُوا۔" [3]

"بنارس میں مولانا ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء میں پہنچے اور جمادی الاول ۱۲۶۷ھ مطابق مارچ ۱۸۵۱ء میں مولانا محمد احسن کا تعلق بنارس سے یقیناً ختم ہوچکا تھا

---

[1] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۵۵

[2] ایضاً: ص ۱۵۴

[3] ایضاً: ص ۳۸

کیونکہ یہی زمانہ بریلی میں آنے کا ہے۔"[۱]

"مولانا محمد احسن صاحب فارسی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے اور مولانا بنارس سے جمادی الاول ۱۲۶۷ھ مطابق مارچ ۱۸۵۱ء میں تبدیل ہو کر بریلی پہنچے۔ مولانا محمد احسن بریلی کالج میں شعبۂ فارسی کے صدر مقرر ہوئے۔ جب عربی کا اجراء ہوا، تو دونوں شعبوں کی صدارت اِن ہی کو تفویض ہوگئی۔"[۲]

مولوی محمد مظہر نانوتوی کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد منیر نانوتوی بھی دہلی کالج کے پروردہ اور مولوی مملوک علی نانوتوی کے تلمیذ تھے۔ موصوف دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے تھے۔ قادری صاحب یُوں لکھتے ہیں:

"مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۳۱ء میں نانوتہ میں پیدا ہُوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ لطف علی سے حاصل کی۔ پھر دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی...... ۱۳ مئی ۱۸۶۱ء میں بریلی کالج میں ملازم ہو گئے۔ مطبع صدیقی بریلی کے مہتمم رہے اور اُس کا نظم و نسق زیادہ تر اِن ہی سے متعلق رہا۔ بریلی سے پنشن پائی۔ ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء کے بعد بریلی سے تعلق ختم ہو گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بہت گہرے تعلقات اور دونوں بچپن کے ساتھی تھے مولانا محمد منیر صاحب قریب دو سال دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے۔ ایمانداری و دیانتداری میں جواب نہیں رکھتے تھے۔"[۳]

قارئین کرام! یہ تھے دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کی بنیادیں رکھنے والے، وہاں پڑھانے والے اور اُنھیں چلانے والے۔ مذکورہ بالا حوالوں سے صاف واضح ہے کہ پہلے اِن حضرات کو دہلی کالج میں گورنمنٹ نے اپنے ڈھب پر تربیت دی۔

---

[۱] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۳۹

[۲] ایضاً: ص ۴۳

[۳] ایضاً: ص ۱۵۷، ۱۵۸

اِس کے بعد بڑھاپے تک اُنھیں سرکاری ملازمت میں رکھ کر اچھی طرح اُن کی وفاداری کا صِلہ دیا گیا۔ بعض حضرات کو کالجوں میں پروفیسر رکھا گیا اور دُوسرے ڈپٹی انسپکٹر مدارس (کالے پادری) بنا کر رکھے گئے۔ جب یہ صاحبان نازک سے نازک مواقع پر بھی اپنی مہربان حکومت کے وفادار ہی ثابت ہُوئے تو ریٹائر ہونے کے بعد اِن کی طرف الہام کر دیا جاتا تھا کہ اب آپ دین کے نام پر مسلمانوں کے دیندار طبقے کی رہنمائی کریں یعنی مسلمان آپ حضرات سے دین بصد شوق حاصل کریں لیکن حکومت کے مکمل وفادار اور بہی خواہ رہنے کی تربیت دینی ہوگی اور اُنھیں اُسی رنگ میں رنگنا ہوگا، جس میں آپ لوگوں کو رنگا گیا ہے۔

حکومت تو اِن مدارس کی اندرونِ خانہ سرپرستی کر رہی تھی اور یہ ساری مشینری اِسی دستِ غیب سے چل رہی تھی۔ دُوسری طرف مسلمانوں کو اِدھر مائل کرنے کی غرض سے دیوبندیوں نے کارکنانِ دارالعلوم دیوبند کے زہد و تقویٰ، خلوص و للّٰہیت اور کشف و کرامت کے ایسے افسانے گھڑنے شروع کر دیئے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بھی کان کاٹ لیے اور بھولے بھالے مسلمان اِن کے جال میں پھنسنے شروع ہو گئے۔ یہ جال ایسا طلسماتی بنایا گیا کہ اُس وقت اِس چکر کو کیا سمجھ سکتے جبکہ پاک و ہند کے کتنے ہی مدعیانِ اسلام آج تک اِس کی تعلیمات کے زہرِ ہلاہل کو اُس کی ظاہری خوشنمائی کے پیشِ نظر سمجھ نہیں پائے اور اِس زہر کو تریاق سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

وہابیت کا اصلی اور پہلا ایڈیشن مکمل طور پر ناکام ہُوا۔ رہی سہی کسر معرکۂ بالاکوٹ نے نکال دی۔ علمائے کرام کا اِس کی تردید اور بیخ کنی میں سرگرم ہو جانا اور عوام الناس کا اِس نئے مذہب والوں سے نفرت کرنا، ایسے امور تھے جن کی بنا پر یہ گروہ بڑھنے کی بجائے مزید سکڑ کر رہ گیا اور ڈیڑھ صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی، یہ شروع میں محمدی گروہ پھر موحدین اور آجکل اہلحدیث کہلانے والے ہندو پاک میں انگلیوں پر گِنے جا سکتے ہیں۔ آخر اِس گروہ نے گورنمنٹ کی سرپرستی کے باوجود ترقی کیوں نہ کی؟ بات دراصل یہ ہے کہ جب کتاب وہابیت کا دُوسرا ایڈیشن دیوبندیت کے نام سے دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے لگا تو یہ اتنا میٹھا اور خوشنما زہر تھا کہ عوام الناس اِس کی مضرت کو

محسوس نہ کر سکے اور اِس کثرت سے اِس زہر ہلاہل کے طلبگار ہونے شروع ہو گئے کہ حکومت بھی ہزار جان سے اِس کی بلائیں لینے لگی اور اہلحدیث جماعت پر جو خصوصی نظر تھی وہ مع اضافہ دارالعلوم دیوبند پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔

چند علماء نے دیوبندی قسم کی روش اختیار کر کے دہلی کالج سے تربیت پا کر، یہ مشن جاری کیا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ درخت پروان چڑھا، پھلا پھولا اور اِس کی شاخیں پاک و ہند کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں کیونکہ بعض بھولے بھالے مسلمان اِن حضرات کے زبردست پروپیگنڈے کے باعث اِنھیں خطرناک ترین وہابی نہیں بلکہ مُصلح سمجھ بیٹھتے تھے۔ یہ اسلامی عقائد میں اِس غیر محسوس طریقے سے کفریہ عقائد و نظریات کی آمیزش کر کے مسلمانوں کے دین و ایمان کو برباد کرتے رہے ہیں کہ مارے خوشی کے انگریزی حکّام بھی پھڑک اُٹھتے تھے اور عنایات و نوازشات کا اندرونِ خانہ وہ اہتمام کیا کہ جس جماعت کی تعداد پانچ دس ہزار سے زائد نہ تھی اُن کا مدرسۂ دیوبند، چھپّروں اور جھونپڑیوں سے ترقی کرتا ہُوا، جامع ازہر کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مذہبی درس گاہ بن گیا۔

دارالعلوم دیوبند اور دیوبندی گروہ کی ترقی گویا اہلحدیث حضرات کی تنزّلی کا پروانہ تھا۔ اِس کی ترقی کے ساتھ ہی یہ حضرات یتیمی اور کس مپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ اِس دوران میں اِس محمدی یا اہلحدیث گروہ کا دو چار مقامات پر انگریزوں سے ٹکراؤ بھی ہُوا، لیکن حاصل کچھ نہ ہوا بلکہ نقصان ہی اٹھاتے رہے اور آخر کار یہ لوگ بھی اپنی اکثریت کے ساتھ متفق ہو کر حکومت کی وفاداری اور بہی خواہی پر ایمان لے آئے۔ میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء)، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی (المتوفی ۱۳۰۷/ ۱۸۸۹ء) اور مولانا محمد حسین بٹالوی وغیرہ حضرات کی سرکردگی میں ساری جماعت ہی حکومت کے قدم چُومنے پر متفق ہو گئی۔ اِس جماعت کی زندگی کے یہ تین ادوار ہیں یعنی پہلے دَور میں گورنمنٹ کے منظورِ نظر، دُوسرے دَور میں اکثریت وفادار اور بعض حکومت کے خلاف اور تیسرے دَور میں سب حکومت کے بہی خواہ اور منتظرِ نظرِ کرم۔

دارالعلوم دیوبند جو دہلی کالج کی شاخ اور وہابی حضرات کا دوسرا مرکز بنا، اِس پر بھی

دو دَور گزرے ہیں اور دونوں ایک دُوسرے سے مختلف۔ ابتدائی ایام اور پہلے دَور میں انگریزوں کی مکمل سرپرستی اور تائید وحمایت حاصل رہی۔ خوب جی بھر کر عنایتِ سرکار کے مزے لُوٹے۔
دُوسرا دَور وُہ ہے جب متحدہ ہندوستان کی سرزمین میں گاندھی کی آندھی چلی۔ ہنود نے خفیہ منصوبے کے تحت حکومت کے ہر محکمے میں، فوج اور پولیس میں اپنے آدمی کثیر تعداد میں شامل کر لیے۔ تجارت وملازمت اور صنعت وحرفت کے ذریعے خوشحال ہونے لگے تو ہمدردیوں کے جال پھاکر سُود در سُود کے چکّر میں مسلمانوں کی جائدادوں پر قابض ہونے شروع ہو گئے۔ غرضیکہ ہر قسم کی طاقت وقوت حاصل کر لینے کے بعد ہندوؤں نے حصولِ آزادی کی خاطر انگریزوں سے سرد جنگ جاری رکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اِس دَور میں علمائے دیوبند نے محسوس کیا کہ ہنود کی بے پناہ تیاریوں کے مقابلے میں اب انگریز زیادہ عرصہ ہندوستان پر قابض نہیں رہ سکتے اور وُہ دِن دُور نہیں کہ ہندوستان کی فضاؤں میں اوم کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا ہوگا۔ صورتِ حالات کا اِس طرح تجزیہ کرنے کے بعد علمائے دیوبند نے اپنے سرپرستوں اور محسنوں کو الوداعی سلام کیے بغیر متوقع حکمرانوں کے در کی گدائی شروع کر دی۔ کانگرس نے اِن حضرات کی ناز برداری اور تالیفِ قلب کا پُورا پورا خیال رکھا اور انگریزوں سے بھی بڑھ چڑھ کر اِنھیں نوازتے رہے۔ اِس دَور میں یہ حضرات مکمل طور پر ہندو مفادات کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ لٹانے کے لیے تیار بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت یہ حضرات ہندوؤں پر کچھ اِس طرح پروانہ وار نثار اور گاندھی جی کے پُجاری ہو کر رہ گئے کہ ہندوؤں نے اِنھیں انگریز کی گولیوں کا نشانہ بننے کی ترغیب دی تو یہ لبیک کہہ کر سوراج کے دیوتا پر بھینٹ بن کر چڑھنے کے لیے تیار ہو جاتے اور ایسی موت کو شہادتِ عظمیٰ سے کسی طرح کم ماننے پر تیار نہ ہوتے اور اگر گاندھی جی یا پنڈت جواہر لال نہرو نے اِنھیں مسلم مفادات پر کاری ضربیں لگانے کا حکم دیا یا ترغیب ہی دلائی تو یہ حضرات اپنے اصطلاحی مشرکوں اور بدعتیوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا کرتے تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانانِ پاک وہند کے مفادات کو جتنا نقصان اِس تحریک وہابیت نے پہنچایا ہے اِتنا مشرکینِ ہند بھی آج تک نہیں پہنچا سکے ہیں۔ اپنے دُوسرے دَور میں دیوبندی حضرات واقعی انگریزوں کے

مخالف بن کر بھی رہے لیکن ہندو مفادات کی خاطر مسلم مفادات کے لیے اِن حضرات کا وجود جملہ خوارج کی طرح ہمیشہ ایک چیلنج بن کر ہی رہا ہے۔ باری تعالیٰ شانہٗ ابنائے زمانہ کو سچی ہدایت نصیب فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر ہو۔ آمین۔

علی گڑھ مرکز بقول مولوی عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) دہلی کالج کا انگریزی حصہ، اسی کالج کے تربیت یافتہ سر سید احمد خاں علی گڑھ لے گئے۔

گویا پہلے جو وہابی حضرات کا ماڈرن اور پُراسرار مرکز، دہلی کالج مقرر ہُوا تھا، آگے چل کر اُس کے دو حصے یا دو مراکز بن گئے، ایک دیوبند اور دُوسرا علی گڑھ۔ اِس دُوسرے مرکز علی گڑھ کو مغربی تعلیم و تہذیب کے دلدادگان کا مرکز قرار دیا گیا اور آہستہ آہستہ پُورے ملک میں اِس کی برانچیں قائم کر دی گئیں جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مستقل مراکز کی حیثیت حاصل کرتی چلی گئیں۔ اِس طرح پُورے ملک میں مغربی علوم اور مغربی تہذیب چھا گئی اور یہ دونوں چیزیں اِس طرح پاک و ہند کے باشندوں کے دماغ و اعصاب پر سوار ہُوئیں کہ انگریزوں کو ہمارے ملک سے گئے ہُوئے چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے لیکن اِن مغربی لعنتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا تو دُور کی بات ہے، خود مسلمان کہلانے والوں نے انھیں اِس طرح اپنا ضابطۂ حیات اور لائحۂ عمل بنایا ہُوا ہے، جیسے مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی کا راز قرآن و سنّت کے احکام کی پیروی میں مضمر نہیں بلکہ مغربی لعنتوں میں ہے۔ باری تعالیٰ شانہٗ ہمیں سوچنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

علی گڑھ کالج کے بارے میں عرض کرنے سے پہلے اِس حقیقت کا اظہار کر دینا ضروری نظر آتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد برٹش گورنمنٹ نے جو پالیسی وضع کی اُس کو مولوی عبد الخالق قدوسی کے لفظوں میں بیان کر دیا جائے:

"بات دراصل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے تلخ تجربہ کے بعد انگریز سرکار اِس قدر حسّاس ہو چکی تھی کہ وہ جب بھی ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں کسی قسم کے اضطراب و اشتعال کے آثار محسوس کرتی تو قبل اِس کے کہ حالات خطرناک صورت اختیار کر جائیں، مسلمان قوم کے سامنے کوئی نئی چیز مسلمان لیڈروں

کے ہی ذریعے پیش کر دیتی، جس سے مشتعل قوم کا رُخ خود بخود دوسری طرف پھر جاتا۔“ ؎۱

علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی کی تحریک کیوں چلائی گئی؟ مولوی سید سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) نے اس پُراسرار حقیقت کے چہرے سے یُوں پردہ ہٹایا تھا:

”واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں کے سبب سے مسلمانوں میں بے حد جوش وخروش تھا اور انگریزوں کی طرف سے دلوں میں بے حد ناراضی اور نفرت پھیلی تھی اور اُن کی ذرا ذرا سی بات سے مسلمانوں کو چڑ ہوتی تھی۔ حکّام کے سامنے اِن ناخوشگوار حالات کا تدارک از بس ضروری تھا۔ اِس لیے بہترین تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسی عالمگیر تحریک شروع کر دی جائے جو مسلمانوں کے رُخ کو اِدھر سے اُدھر پھیر دے۔ یہ چیز ایک مسلم یونیورسٹی کا تخیّل تھا، جس کو لے کر ہز ہائنس سر آغا خاں، جو اُس وقت کے مسلم قومی راہنما اور انگریزوں کے معتمد تھے، آگے بڑھے۔“ ؎۲

علی گڑھ کالج کے اصل کرتا دھرتا سر سید احمد خاں تھے۔ دہلی کالج سے تحریف شدہ مذہب یعنی وہابیت کو بشکلِ دیوبندیت لے کر آئے تھے لیکن علی گڑھ میں آکر کریلا اور نیم پر چڑھ گیا، موصوف نیچریت کے بانی بن گئے اور اِس طرح مسلمانوں کی خیر خواہی واصلاح کے نام پر ساتھ ساتھ مقدس اسلام کی بیخ کنی کا فریضہ، جو حکومت کی طرف سے عائد ہوا تھا، سرانجام دے کر گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرتے رہے۔ مسلمانوں کی خیر خواہی معیوب نہیں، اُنھیں تباہ کن حرکتوں کے نتائج سے خبردار کرنا دشمنی نہیں، دولت، علم و فن اور اخلاق وکردار میں مسلم قوم کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنا بدخواہی نہیں بلکہ یہ امور تو مستحسن ہیں۔ اگر واقعی یہ مُصلح اور ریفارمر بننے والے بھی کچھ کرنا چاہتے تھے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ

؎۱ ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور، بابت ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۵

؎۲ سلیمان ندوی، مولوی: حیاتِ شبلی، ص ۵۳۱

علیہ وسلم کے دین پر عملِ جرّاحی کی مشق کس غرض سے فرمائی گئی تھی؟ مسلمانوں کے دین وایمان کو تباہ و برباد کرنے والا کیا اُن کی حقیقی خیر خواہی کے تصوّر سے بھی آشنا ہو سکتا ہے؟ نیچریت پر گفتگو، ہم انشاء اللہ تعالیٰ باب سوم میں کریں گے۔ دہلی کالج کا انگریزی حصّہ علی گڑھ لایا گیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علی گڑھ سے کہاں تک پھیلا۔ بریلی اور میرٹھ کی درس گاہوں کے بارے میں ملاحظہ ہو:

"بریلی کی یہ درس گاہ اور میرٹھ اسکول، دہلی کالج کی شاخ قرار پائے۔ ۱۸۴۰ء تک بریلی اسکول میں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں بریلی کا اسکول، کالج بنا دیا گیا۔" [۱]

ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کی وجہ مولوی سیّد سلیمان ندوی (۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) نے یہ بتائی ہے:

"گورنمنٹ نے مسلمانوں کے اِس زخم پر رکھنے کے لیے جو مرہم تجویز کیا اُس کا نام ڈھاکہ یونیورسٹی ہے۔ اِس یونیورسٹی کی تجویز اور خاکہ بنانے میں اُن لوگوں کو بھی شریک کیا جو احرار کے سرگروہ سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ نئے تعلیم یافتوں میں سے محمد علی مرحوم اور علماء میں سے مولانا شبلی کے نام اُس سب کمیٹی میں داخل ہوئے جو اسلامک سٹڈیز کے لیے بنی تھی۔" [۲]

وہ زخم کیا تھا، جس پر ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کا مرہم لگایا گیا؟ اِس کا جواب مولوی عبدالخالق قدوسی کی زبانی سُنیے:

"اِسی طرح ۱۹۱۰ء میں جب تقسیمِ بنگال کی تنسیخ کا فیصلہ ہوا تو مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ہوا اور ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گورنمنٹ نے اِس کا علاج جو تجویز کیا، وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام تھا۔" [۳]

---

[۱] محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۴۳

[۲] سلیمان ندوی، مولوی: حیاتِ شبلی، ص ۵۲۰

[۳] ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور، بابت ۲۳ر اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۵

یونیورسٹیوں کا قائم ہونا تھا کہ برّصغیر پاک و ہند میں انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا جال پھیلا دیا گیا اور انگریز نے اِن کے ذریعے جس مقصد کو حاصل کرنا تھا وہ بڑی آسانی سے حاصل ہو گیا۔ انگریزی زبان کا سیکھنا اور سکھانا بُرا نہیں، یہ بھی دُوسری زبانوں کی طرح ایک زبان ہے اور اِس کا سیکھنا کسی طرح معیوب نہیں ہو سکتا۔ اِن انگریزی کالجوں اور اسکولوں کی دو باتیں معیوب تھیں جو سنتِ نصاریٰ کے طور پر آج تک کمال عقیدت کے ساتھ اپنائی ہُوئی ہیں اور مسلمان کہلانے والے بھی اُن معائب کو دُور کر کے اپنی درس گاہوں کو باعثِ خیر و برکت کر دکھانے اور اِنھیں دنیا و عقبیٰ کی کامیابی و کامرانی کا ذریعہ بنانے سے کتراتے رہتے ہیں۔ اِن سرکاری درسگاہوں کی دونوں خرابیوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ادارے مغربی تہذیب و تمدّن سکھانے کی تربیت گاہیں بنائے گئے ہیں اور دُوسری خرابی یہ کہ اسلامی علوم و معارف سے طلبہ کو علمی اور عملی طور پر، بڑی حد تک دُور ہی رکھا جاتا ہے۔ انگریز تو مسلمانوں کو اور خصوصاً اُن کے پڑھے لکھے طبقے کو دین سے ناواقف دیکھنا اور رکھنا چاہتا تھا لیکن پاکستان کی کسی حکومت نے آج تک یہ وضاحت کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ وہ اپنی درسگاہوں سے اسلام کو باہر نکال کر، مسلمانوں کی موجودہ نسل کو دین سے ناواقف رکھ کر کون سا مقدس مقصد حاصل کرنے کے درپے ہے؟

پاک و ہند میں انگریزی درس گاہوں کے محرک بننے کا جس ہستی کو حکومتِ وقت نے شرف بخشا تھا، وُہ سرسیّد احمد خاں تھے۔ موصوف کے بارے میں شیخ اکرام صاحب اِسی تعلیم سے متعلق یُوں وضاحت کرتے ہیں:

"خود سرسیّد ۱۸۹۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: "تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جن سے قومی بھلائی کی اُمید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم ہوتے جاتے ہیں۔" [۱]

اصل بات یہ ہے کہ اِن درس گاہوں کے ذریعے حکومت یہی چاہتی تھی کہ مسلمان اپنے اسلاف

[۱] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، مطبوعہ فیروز سنز لاہور، بار ہشتم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۲۸

رشتہ منقطع کرلیں اور حکومتِ وقت کے مکمل وفادار بن جائیں۔ شیخ اکرام صاحب نے اس حقیقت کو یُوں بیان کیا ہے:

"علی گڑھ تحریک کے راہنماؤں میں ذہنی آزادی کی کمی نہ تھی۔ قوم کو سلف کی کورانہ تقلید سے آزاد کرانے اور اِس تقلید کے حمایتیوں کی مخالفت برداشت کرنے کے لیے بڑی جرأت اور صحیح آزاد خیالی کی ضرورت ہے اور سرسید، حالی اور اُن کے رفقاء میں یہ آزاد خیالی پُوری طرح موجود تھی، لیکن اِس کے باوجود اِن بزرگوں کی تصانیف پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ اِنھیں مغرب سے ایک قسم کا حُسنِ ظن تھا اور مغربی تعلیم، مغربی ادب اور مغربی علوم و فنون سے اُنھیں ایسی توقعات تھیں جو زیادہ تر عقیدت یا ناواقفیت پر مبنی تھیں۔ مغرب سے اِن بزرگوں کو تو فقط ایک حُسنِ ظن تھا لیکن جن لوگوں نے انگریزی کالجوں میں تعلیم پائی، اُن میں غلامانہ ذہنیت بُری طرح جلوہ گر تھی۔ اُن کے نزدیک مغرب کی ہر ایک چیز اچھی تھی اور مشرق کی ہر ایک چیز بُری"۔[1]

علی گڑھی تحریک نے مغربی علوم و فنون کو متحدہ ہندوستان میں رائج کرنے اور مسلمانوں کو اُن کے دین و مذہب سے بے بہرہ رکھنے کی جس برطانوی پالیسی کی بیل منڈھے چڑھائی اُس کے بدترین نتائج آج بھی پُوری قوم کو بھگتنے پڑ رہے ہیں اور اب وہی لوگ قوم کی قسمت کے مالک اور اِن کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد، جس اسلام کے نام پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے اُسی سے پاکستان کی ہر حکومت اِس طرح ڈرتی اور بدکتی آئی ہے جیسے سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے اور اِسی خطرے کو ٹالنے کی خاطر اسلام کے رہے سہے نشانات کو مٹانے کی اِس طرح سے مسلسل کوشش کی جاتی رہی ہے کہ گویا اسلام دشمنی میں انگریز بھی اِن کے شاگرد ہی تھے۔ اِن درسگاہوں کی مضرت کا پہلو اہلِ نظر کو بروقت بھی نظر آرہا تھا۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی اِس حقیقت کا

---

[1] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۲۸۰

اِن لفظوں میں اعتراف کیا ہے:

"اگر آپ اُن بزرگوں کا معاملہ اُن کے ضمیر اور احساسِ فرض پر چھوڑیں اور ارکانِ مذہب کی ظاہری پابندی کو بھی ایک لمحے کے لیے نظر انداز کر دیں تب بھی علی گڑھ کی فضا میں اندر ہی اندر ایک عام ایمانی کمزوری اور روحانی کم ہمتی کا سراغ ملے گا۔" [۱]

اِس قدر تسلیم کر لینے کے بعد بھی آج تک کالج اُسی ڈگر پر چلائے جا رہے ہیں۔ خود علامہ شبلی نعمانی اور حالی پانی پتی بھی اِسی نتیجے پر پہنچے تھے۔ اِن دونوں حضرات کے متعلق یُوں مذکور ہے:

"علی گڑھ کی علمی پستی سے مولانا (شبلی) کو جو شکایت تھی وُہ بجا ہے اور ہم اس پر گزشتہ اوراق میں تفصیلی تذکرہ کر چکے ہیں۔ کالج کی یہ کوتاہی اِس قدر افسوسناک تھی کہ اُس نے حالی جیسے فرشتہ خصلت انسان کو بدل کر دیا۔ وہ سرسید کا ذکر کرتے ہُوئے لکھتے ہیں: "چھبیس برس کے تجربے سے اُن کو اِس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہو گا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمّی، فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔"" [۲]

مسلم یونیورسٹی کے قیام، اسکولوں اور کالجوں کے اجراء اور اِن کے ذریعے مغربی علوم و فنون اور تہذیب سے مسلمانانِ ہند کو بہرہ ور کرنے نیز اسلام سے کورا رکھنے کی جو سرسید احمد خاں صاحب اور حکومتِ وقت نے کوشش کی تھی، اُس میں کہاں تک کامیابی ہُوئی؛ اِس حقیقت کے چہرے پر آج تو مطلقاً کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔ ہر صاحبِ نظر اپنی آنکھوں سے نونہالانِ قوم کی حالتِ زار دیکھ کر خُون کے آنسو روتا ہے کہ یہ ہے قوم کی

---

[۱] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۱۵۱

[۲] ایضاً: ص ۲۸۸

وہ متاعِ گراں مایہ جن کے ہاتھوں میں کل ملت کی تقدیر ہو گی۔ جس قوم کی قسمت کے مالک یہ نونہال ہوں گے اُس کا مقدر اندھیری رات میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ مغربی علوم و فنون سے فیض یاب ہونے والوں کی یہ افسوس ناک حالت پہلے ہی روز سے دکھائی دینے لگی تھی۔ چنانچہ مولوی ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) کے شریکِ کار، فضل الدین احمد صاحب کا ایک بیان یُوں منقول ہے:

"یہ بات عام طور پر مسلّم ہو چکی تھی کہ نئی تعلیم یافتہ جماعت کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں اور اسکول اور کالج کی تعلیم اور مذہبی زندگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ترکی ٹوپی اوڑھے ہُوئے، نماز پڑھتا ہوا نظر آجاتا یا قرآن شریف کی کوئی آیت اُس کی زبان و قلم سے نکل جاتی تو لوگوں کو ایک نہایت تعجب انگیز اور غیر معمولی واقعہ معلوم ہوتا۔ ایک خاص واقعے کی طرح اُس کا ذکر کیا جاتا کہ فلاں شخص نے کالج میں تعلیم پائی ہے اور ساتھ ہی نماز بھی پڑھ لیا کرتا ہے۔"[۱]

یہ تھے اینگلو انڈین علماء کے قائم کردہ دو مراکز جو دیوبند اور علی گڑھ میں قائم ہُوئے۔ اول الذکر مرکز کے کارکنوں نے خود کو دینی تعلیم کی کمی دُور کرنے اور مسلمانوں کو علومِ دینیہ سے مالا مال کر دینے والے ٹھیکیداروں کی صورت میں ظاہر کرنا شروع کیا اور موخر الذکر نے ملتِ اسلامیہ کو بتانا شروع کیا کہ ہم تو آپ کی مادّی حالت کو سنوار کر مسلمان قوم کو ترقی کی منزلوں پر لے جانا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی دونوں مراکز سے وہابیت کے دو نئے ایڈیشن بھی شائع ہُوئے اور وہ مستقل فرقوں کی شکل میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر مسلمانوں میں تفریق و تشتّت کا بیج بو گئے۔ دونوں مراکز کے ظاہری طور طریقے اگرچہ ایک دُوسرے کی ضد تھے لیکن بہر صورت دونوں میں اشتراکِ عمل کا جذبہ موجود تھا۔ مثلاً:

"علی گڑھ اور دیوبند کے اختلافات اصولی تھے اور کسی بُغض و عناد یا رشک و

---

[۱] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۲۷۹

حسد پر مبنی نہ تھے۔ اِس لیے اِن میں تلخی کبھی نہیں آئی۔ اِس کے علاوہ چونکہ دیوبند اور علی گڑھ قوم کی دو مختلف ضروریات (دینی اور دنیوی تعلیم) کو پورا کرتے تھے، اِس لیے ایک وقت ایسا بھی آیا جب اِنھوں نے تقسیمِ کار کا اصول اختیار کیا اور اپنے مختلف مقاصد کے حصول کے لیے ایک دُوسرے سے اشتراکِ عمل کیا۔" [1]

اہلسنت وجماعت کے ناجی گروہ میں سے مسلمانوں کو اغوا کر کے جو فرقے بنائے جارہے تھے اُن کی تعداد یہاں آکر تین ہوگئی تھی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ اہلحدیث ——— بانی مولوی محمد اسمٰعیل دہلوی

۲۔ دیوبندی ——— بانی مولوی محمد اسحاق دہلوی

۳۔ نیچری ——— بانی سر سید احمد خاں علی گڑھی

اہلحدیث جماعت کی ترقی تو کس مپرسی کے باعث جامد ہو کر رہ گئی تھی مگر دین سے دلچسپی رکھنے والے بعض مسلمان دیوبندی گروہ کے جال میں پھنستے رہے، پھر بھی ایک دو مدرسے پورے ملک کے عوام پر کیا اثر انداز ہو سکتے تھے؟ لیکن جب سے اِن حضرات نے اپنے تبلیغی رضاکاروں کو اِس امر پر مامور کر دیا کہ وہ اہلسنت کے عوام کو اغوا کریں اُس وقت سے اِس جماعت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا ہے۔ نیچری مذہب خود تو ختم ہو گیا لیکن مرنے سے پہلے دو وارث چھوڑ گیا:

۱۔ منکرینِ حدیث

۲۔ مرزائی

ندوہ

نیچریت سے بھی زیادہ نقصان، ملتِ اسلامیہ کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم نے پہنچایا، جس کے باعث اکثر پڑھے لکھے صرف نام کے مسلمان رہ گئے اور بعض تو بڑے ننگِ دین وملت ہی ثابت ہوئے ہیں اور قوم کو ذہنی آوارگی اور پراگندہ خیالی

[1] محمد اکرام شیخ، موجِ کوثر، ص ۲۴۹

کی تربیت دینے کا یہ سلسلہ ہنوز اُسی طرح جاری ہے۔ نونہالانِ ملت اِن دونوں چکروں میں پھنستے جارہے تھے اور اَن پڑھ مسلمان بھی، اِن دونوں جماعتوں کی کامیابی کے راستے میں علمائے اہلسنت ہی مزاحم تھے لہٰذا اِن حضرات پر قابو پانے کی غرض سے ندوۃ العلماء کا جال بچھایا گیا۔ لیکن کیسی مزیدار ڈپلومیسی کے ذریعے یہ جال پھیلایا، مندرجہ ذیل حوالے کی تہہ میں جھانک کر اُس کا اندازہ کیجیے:

"اِس عمدہ خیال (قیامِ ندوہ) کے محرک مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے، مگر اِس کی تکمیل مولوی سید محمد علی کانپوری خلیفۂ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے مبارک ہاتھوں سے ہُوئی، جو اِس کے بانی اور ناظمِ اوّل تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی صاحبِ تفسیرِ حقانی نے اِس کے قواعد وضوابط مرتب کیے۔ اکابرِ قوم مثلاً سرسید، نواب محسن الملک اور نواب وقارالملک نے بھی اِس کے اغراض ومقاصد کو پسند کیا اور تحریر وتقریر کے ذریعے سے اِس کا خیر مقدم کیا۔ ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھولے گئے اور ۱۸۹۹ء میں رؤساء شاہجہان پور کی فیاضی سے کچھ زمینداری بطور وقف ندوۃ العلماء کو حاصل ہُوئی۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ کی بنیاد بھی ڈالی گئی۔"[۱]

وہ کون سی ضرورت یا مصلحت تھی جس کے تحت "ندوۃ العلماء" کا قیام عمل میں آیا؟ اِس بارے میں جناب شیخ محمد اکرام ایم۔اے نے اپنے خیالات کا اِن لفظوں میں اظہار فرمایا ہے:

"جدید علم الکلام بالعموم اُن شخصوں نے ترتیب دیا، جو عربی اور فارسی کے فاضل تھے لیکن عام علماء کی جماعت سے اُنھیں کوئی تعلق نہ تھا اور بالعموم علمائے اُن کی مخالفت کی۔ مگر آہستہ آہستہ علماء میں بھی کچھ لوگ ایسے

---

[۱] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۱۸۷، ۱۸۸

پیدا ہو گئے جنھیں اِس ضرورت کا احساس ہُوا کہ اسلامی مدارس کا نصاب ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بنایا جائے اور قدیم علماء اور علی گڑھ پارٹی کے بین بین ایک تعلیمی اور مذہبی طریقہ کار قائم ہو۔ چنانچہ اِس مقصد کیلیے ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہُوا" ؎۱

ندوہ کے بارے میں دیو بندی جماعت کے حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/ ۱۹۴۳ء) نے اپنے تاثرات کا مشاہدے کی روشنی میں اِس طرح اظہار کیا ہے:

"خود ندوہ کا جو حشر ہُوا سب کو معلوم ہے کہ وُہ ایسوں کے ہاتھ میں مدت تک رہا جن کی طبیعت میں بالکل نیچریت تھی۔ وہی سر سید احمد خاں کے قدم بقدم اُن کی رفتار رہی۔ وہی جذبات، وہی خیالات، کوئی فرق نہ تھا" ؎۲

یہ ندوی حضرات کے عقائد و نظریات کی بات تھی۔ مناسب نظر آتا ہے کہ علی گڑھ اور دیو بند کی خرابیوں کا ازالہ کرنے کا بیڑا اٹھانے والے، قوم کے دُکھوں کا علاج کرنے والے، مسلمانوں کی کشتی کو بھنور سے نکال کر ساحل پر پہنچا دینے کا اعلان کرنے والے ندوی علماء کے زہد و تقوٰی، خلوص و للّٰہیت اور خیر خواہیِ اسلام و مسلمین کی روحانیت سے لبریز اور سنسنی خیز کہانی مولوی ابو الکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۸ء) کی زبانی پیش کر دی جائے ملاحظہ ہو:

"ندوۃ العلماء کے اجتماع سے مجھے روشن علماء کی جو حالت منکشف ہُوئی کیونکہ منتسبینِ ندوہ کی طرف میرا ایسا ہی حُسنِ ظن تھا، اُس سے طبیعت کو اور زیادہ مایوسی اور طبقۂ علماء کی طرف سے سخت وحشت پیدا ہو گئی۔ مخالفین ندوہ وہاں جو کچھ کہہ رہے تھے اُن کی نسبت تو خیال تھا کہ یہ روشن خیال نہیں ہیں

؎۱ محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۱۸۷

؎۲ ملفوظاتِ تھانوی صاحب: الافاضات الیومیہ، جلد ۵، ص ۱۱۰

لیکن جو لوگ ندوہ کے لیے سرگرم تھے اُن کی بھی عجیب حالت نظر آتی تھی۔ چونکہ پانچ چھ مہینے تک اِن سرگرمیوں کو بالکل قریب سے دیکھتا رہا، اِس لیے اندرونی حالت بالکل میرے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ بالکل چالاک دنیاداروں کی سی کارروائیاں کی جا رہی ہیں اور وُہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے جاتے ہیں جو اپنی کامیابی کے لیے ایک شاطر سے شاطر اور عیار سے عیار جماعت کر سکتی ہے۔ لوگوں کو شامل کرنے کے لیے ہر طرح کی عیاریاں کی جاتی تھیں۔ میرے سامنے ایک واعظ نے ندوے کے ایک سرگرم ایجنٹ سے مشورہ کیا کہ مجلسِ وعظ میں کیونکر اُن کو اظہارِ جوش و خروش کرنا چاہیے اور کیونکر آخر میں نالہ و بکا شروع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ تجویز پختہ ہوگئی۔ اِس کے بعد واعظ نے جونہی مثنوی کی ایک حکایت شروع کی دُوسرے صاحب نے معاً کھڑے ہو کر حال بازوں کی طرح حرکتیں شروع کر دیں۔ اِس سے مجلسِ وعظ میں بڑی رقّت ہوگئی اور اِس قدر آہ و بُکا ہُوا کہ اِس پر وعظ ختم کر دیا گیا۔ اِس طرح کی بیسیوں باتیں روز دیکھتا تھا اور میرے دل میں اِس طبقے کی طرف سے وحشت بڑھتی جاتی تھی۔"[1]

ندوۃ العلماء کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد کِس بزرگ نے رکھا تھا، یہ بھی ملاحظہ فرما لیا جائے:

"ندوہ کی تاریخ میں ۱۹۰۸ء کا سال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اِس سال صوبہ (یُو۔پی) کے گورنر نے دارالعلوم کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا اور حکومت کی طرف سے ندوہ کو بعض مقاصد کے لیے پانچ سو روپے ماہوار امداد ملنی شروع ہُوئی۔"[2]

جب ندوۃ العلماء کی وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا، اُس وقت رنگ برنگے

---

[1] آزاد کی کہانی، ص ۲۱۷، ۲۱۸

[2] شیخ محمد اکرام، شبلی نامہ، ص ۱۷۸

حاضرین کا مجمع، ندوہ کے کرتا دھرتا، علّامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء) کی روحانیت کو کس طرح مسرور کر رہا تھا، اِس کا اندازہ خود علّامہ شبلی کے مندرجہ ذیل فخریہ بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

"یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علماء عیسائی فرمانروا کے سامنے دلی شکر گزاری کے ساتھ ادب سے خم تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ وسُنّی ایک مذہبی درس گاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی درس گاہ کا سنگِ بنیاد ایک غیر مذہب (یعنی انگریز) کے ہاتھ سے رکھا جا رہا تھا۔ غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی سقف کے نیچے نصرانی، مسلمان، شیعہ، سُنّی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی، واعظ، خرقہ پوش اور کجکلاہ سب جمع تھے۔" [۱]

جس مقصد کی خاطر ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، سعیِ بسیار کے باوجود وہ مقصد حاصل نہ کیا جا سکا۔ علمائے اہلسنّت اِس پُرفریب جال سے دُور ہی رہے۔ بعض سادہ لوح علماء جو بر وقت صحیح اندازہ نہ لگا سکے وُہ صورتِ حال کے سامنے آتے ہی مجتنب ہو گئے۔ شروع میں ندوہ ہر قسم کی بدمذہبی کا معجون مرکب رہا اور نیچریت اِس کا جزوِ اعظم تھا۔ یہ معجون صلح کلّیت کے زہریلے قوام سے تیار کی گئی تھی۔ علّامہ سید سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۳ھ/ ۱۹۵۳ء) کے آخری دور میں یہ ادارہ "دارالعلوم دیوبند" کی ایک شاخ ہی شمار کیا جانے لگا تھا۔

علّامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۴ء) اپنے آخری ایّام میں کچھ دہریت کی طرف مائل ہوتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں جیسا کہ اُن کی تصنیف "الکلام" کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔ رہی موصوف کی ایجاد کردہ صلح کلیت، تو اِس کے بعد گاندھویت کی بلاخیز آندھی

---

[۱] شیخ محمد اکرام: شبلی نامہ، ص ۱۴۰

ایسی ہمہ گیر بن کر چڑھی تھی کہ اِس کے عظیم نقصانات کے سامنے صلح کلیت کے بگولے کی مضرتوں کا چرچا بھی عام زبانوں سے اُتر جانا قدرتی امر تھا۔ گاندھویت اور گاندھوی علماء کے کارناموں کی جھلک باب پنجم میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے۔

مرزائے قادیان انگریزوں نے جب برّ صغیر پاک و ہند میں اپنے قدم جما لیے اور سارے ملک پر قابض ہو جانے کے اُنھیں امکانات بھی نظر آنے لگے تو اُنھوں نے اپنے بعض پادریوں کو اِس امر کا جائزہ لینے کی دعوت دی کہ مسلمانانِ ہند کے اندر، داخلی طور پر، مستقل اور پائدار انتشار و افتراق کس طریقے سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ پادری حضرات نے جائزہ لے کر جو رپورٹ پیش کی، وہ علاّمہ خالد محمود سیالکوٹی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

"یہاں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے۔ اگر اِس وقت ہم کسی ایسے غدّار کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں جو ظلّی نبوّت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہو جائے تو اُس کے حلقۂ نبوت میں ہزاروں لوگ جوق در جوق شامل ہو جائیں گے، لیکن مسلمانوں میں اس قسم کے دعویٰ کے لیے کسی کو تیار کرنا ہی بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل حل ہو جائے تو اُس کی نبوت کو حکومت کے زیرِ سایہ پروان چڑھایا جا سکتا ہے۔ ہم اِس سے پہلے برّ صغیر کی تمام حکومتوں کو غدّار تلاش کرنے کی حکمت عملی سے شکست دے چکے ہیں۔ وہ مرحلہ اور تھا۔ اُس وقت فوجی نقطۂ نظر سے غدّاروں کی تلاش کی گئی تھی، لیکن اب جبکہ ہم برّ صغیر کے چپّے چپّے پر حکمران ہو چکے ہیں اور ہر طرف امن و امان بھی بحال ہو گیا ہے تو اِن حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبے پر عمل کرنا چاہیے جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔"[1]

---

[1] عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، ص ٦

اِس رپورٹ کے بعد یا اِس سے بھی پہلے انگریزوں نے یہ منصوبہ ضرور بنایا ہوگا۔معلوم ایسا ہوتا ہے کہ "صراط المستقیم" کتاب سیّد احمد صاحب بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے دعوئ نبوت کی تمہید ہی تھی، جس میں وحیِ باطنی، عصمت، باری تعالیٰ شانہ، تک صعود اور اُس سے ہمکلامی تک کے دعاوی بھرے پڑے ہیں لیکن دستِ قضا نے اُنھیں منزلِ مقصود پر پہنچنے کی مُہلت نہ دی۔ اِس کے بعد "تحذیر الناس" کتاب بھی کچھ ایسے ہی منصوبے کی تکمیل کا ساتھ دیتی ہُوئی نظر آ رہی ہے لیکن اِس کے مصنّف مولوی محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) بھی اِس بنیاد پر عمارت تعمیر کرنے یا تعمیر کروانے سے پہلے ہی راہیِ ملکِ عدم ہو گئے اور مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸ء) ہی ایسے نکلے جو برٹش گورنمنٹ کے اِس ناپاک منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔ مرزا صاحب کے مذہبی خیالات و رجحانات کے بارے میں شیخ محمد اکرام صاحب کا خیال یہ ہے:

"مولوی چراغ علی صاحب سے مرزا صاحب کی خط و کتابت تھی اور جہاد کے متعلق وہ مولوی صاحب کے ہم خیال تھے۔ اِسی طرح حضرت عیسیٰ کے متعلق اُنھوں نے بیشتر سر سیّد کے خیالات کی پیروی کی لیکن باوجودیکہ اُن کی تعلیمات میں کئی باتیں نو معتزلہ خیالات سے قریب تھیں، وہ اکثر اصولی باتوں میں قدامت پسند تھے اور عام مسلمانوں سے اُن کے معتقدین بالخصوص قادیانی گروہ کا اختلاف بیشتر مرزا صاحب کے اپنے دعاوی کے متعلق ہے۔ اُنھوں نے مسیح موعود، مہدی منتظر اور کرشن اوتار ہونے کا دعویٰ کیا اور یہ ایسے دعوے ہیں، جن کو عام مسلمان غلط سمجھتے ہیں۔ نبوت کا دعویٰ کر کے اور ایک نیا فرقہ کھڑا کر کے اُنھوں نے مسلمانوں میں جو اختلاف پیدا کیا اُسے بھی اکثر مسلمان ناپسند کرتے ہیں۔"[1]

مرزا غلام احمد قادیانی، جہاں سر سیّد احمد خاں اور اُن کے دستِ راست مولوی

---

[1] محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۱۰۸

چراغ علی صاحب کے متبع یا ہم خیال تھے وہاں اُنھیں مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) سے بھی بڑی عقیدت تھی، چنانچہ دیوبندی عالم مولوی عبدالرشید ارشد نے اِس سلسلے میں یُوں وضاحت کی ہے:

"مرزا غلام احمد قادیانی جس زمانے میں براہین لکھ رہے تھے اور اُن کا اخبارات میں چرچا ہو رہا تھا، اُس وقت اُن کو حضرت امام ربانی (یعنی گنگوہی صاحب) سے عقیدت تھی۔ اُس طرف جانے والوں کو پُوچھا کرتے تھے کہ حضرت مولانا اچھی طرح ہیں؟ اور دہلی سے گنگوہ کتنے فاصلے پر ہے؟ راستہ کیسا ہے وغیرہ۔ اُسی زمانہ میں حضرت نے ایک دفعہ یُوں فرمایا تھا کہ "کام تو یہ شخص اچھا کر رہا ہے مگر پیر کی ضرورت ہے ورنہ گمراہی کا احتمال ہے"۔ [1]

بہرحال یہ راز و نیاز کی باتیں ہیں جنھیں ہمارے جیسے نا اہل افراد سمجھ ہی نہیں سکتے کہ مرزا صاحب کو مولوی رشید احمد گنگوہی سے عقیدت کیوں ہُوئی؟ گنگوہی صاحب نے مرزا صاحب کو مردِ صالح کیوں قرار دیا تھا اور اُن کے کاموں کو کس بنا پر سراہا جا رہا تھا؟ نہیں معلوم کہ موصوف کو مرزا صاحب کے بے پیر رہنے اور پیر کی ضرورت ہونے کا کس طرح علم ہوا، یا خود اُن کے پیر ہونے کا شرف حاصل کرنے کے خواہشمند تھے؟ ہم یہ عقدہ بھی حل کرنے سے عاجز ہیں کہ اِدھر تو گنگوہی صاحب اپنی روحانیت سے قادیان کے ایک فرد کی گمراہی کا احتمال بھی دیکھ لیا کرتے تھے لیکن دُوسری طرف اُنھیں وُہ لوگ بھی نظر نہیں آتے تھے جو گنگوہ، انبٹھہ، سہارن پور اور دیوبند میں بیٹھ کر باری تعالیٰ شانہٗ کو جھُوٹا بتاتے رہتے تھے۔ اِس راز کو دیوبندی حضرات تو یقیناً سمجھتے ہوں گے۔

پروفیسر ابو زہرہ مصری نے مرزا غلام احمد قادیانی کا تعارف یُوں کروایا ہے:

"انگریز جو مغربی تہذیب و ثقافت کو دیارِ ہند میں لائے تھے، مغربی تہذیب کے دلدادہ مسلمانوں سے بڑا لگاؤ رکھتے، اُنھیں تقربِ بارگاہ سے مشرف کرتے

---

[1] عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، ص ۲۲۳

اور بڑے بڑے عہدوں سے نوازتے تھے۔ اس قسم کے مسلمان حاکم اُن دیار میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہی وجوہات تھے جن کی بنا پر سرزمینِ ہند گمراہ فرقوں کی قرارگاہ بن گئی۔ غالباً قلتِ تعداد کے علی الرغم اُن فرقوں میں زیادہ نمایاں، قوی تر اور ترقی یافتہ قادیانی گروہ تھا۔ قادیانی فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ اس کے بانی و موسس مرزا غلام احمد قادیانی تھے، جن کی وفات ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ اُس کی نسبت قادیان کی طرف ہے جو ایک قصبہ ہے اور لاہور سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مرزا غلام احمد وہاں مدفون ہیں۔ اُن کی قبر پر "مرزا غلام احمد موعود" کے الفاظ مرقوم ہیں۔ موعود سے مراد یہ ہے کہ مرزا صاحب وہی مہدی ہیں جن کا انتظار کیا جاتا تھا کہ وُہ آکر شریعت کی احیاء و تجدید کریں گے"۔ [۱]

مرزا غلام احمد قادیانی کی تعلیمات کے بارے میں مذکورہ مصری فاضل کی رائے قابلِ غور ہے، فرماتے ہیں؛

"حق بات یہ ہے کہ آپ کا قریبی تعلق ائمۂ شیعہ سے ہے۔ شیعہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اُن کے ائمہ معصوم و ملہم ہیں اور اُن کے ہاتھوں معجزات کا صدور ہوتا ہے تاہم وُہ یہ نہیں کہتے کہ اُن پر وحی نازل ہوتی ہے یا وُہ خدا سے شرفِ ہمکلامی حاصل کرتے ہیں۔ بہرحال مرزا صاحب کی تعلیمات کا اِسلام سے کوئی سروکار نہیں"۔ [۲]

قارئین کرام! جن حضرات کے ذریعے برٹش گورنمنٹ نے تخریبِ دین اور افتراق بین المسلمین کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا، اُن میں سے بعض حضرات کا گزشتہ سطور میں مختصر سا تذکرہ کر دیا ہے۔ یہی تھے وُہ حضرات جنھیں پُراسرار طریقے پر، پروپیگنڈا مشینری کے بل بوتے پر

---

[۱] غلام احمد حریری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۳۰۵

[۲] ایضاً: ص ۳۱۵

پورے برطانوی دور میں مسلمانوں کے رہنما منوایا جاتا رہا اور آج تک انگریزوں کی اُسی سنّت پر کمال سعادت مندی سمجھ کر عمل کیا جا رہا ہے۔ حقیقت تو ہر چشمِ بینا کے سامنے واضح ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اُلٹی گنگا بہائی ہوئی ہے یعنی :ـ

راہزن خضرِ رہ کی قبا چھین کر
رہنما بن گئے ، دیکھتے دیکھتے